اللہ تعالیٰ کے رحم اور فضل کے ساتھ

ماہنامہ

قندیلِ اَدب

فروری ۲۰۱۳

مدیر رانا عبدالرزاق خاں

rana_razzaq@hotmail.com

فون نمبرز۔ 02089449385 07886304637

معاون مدیر و ڈیزائنر

عامر امیر.07903126126

majeedamer20@yahoo.com

نگران ویب سائٹ، ایاز راٹھور

www.bazmesherosukhan.co.uk

فہرست

سخن فہمی۔۔۔۔۔۔رانا عبدالرزاق خاں

اردو ہے جس کا نام۔۔۔عاصی صحرائی

تعارف کتب

خواب آنکھوں میں ٹوٹ جاتے ہیں۔

غزل۔۔۔۔عبیداللہ علیم

غزل۔۔۔مبارک صدیقی

غزل۔۔۔ایوب اولیا

غزل۔۔۔عاصی صحرائی

غزل۔عطاءالمجیب راشد

غزل۔۔۔۔عدیل زیدی

غزل۔۔۔۔عبدالمجید ظفر

غزل۔۔۔۔سہیل لون

غزل۔۔منور احمد کنڈے

غزل۔۔۔۔اقبال اشعر

غزل۔۔۔۔مضطر عارفی

غزل۔۔محمد افضل کنیڈا

لطائف۔۔۔۔رانا بلال افتخار

طنز و مزاح۔۔۔ابن لطیف

برسات کی رات۔امجد مرزا امجد

مزاحیہ شاعری

فاروق قیصر، اطہر شاہ خان

خالد عرفان

مزاحیہ باتیں

عقلمندی

بادشاہ سلامت

ایک دعا

کچھ لوگ

زندگی کا کھیل

شمائل حضرت سرور کونین ﷺ (عامر امیر)

اشعار۔۔۔۔۔۔۔عامر امیر

سخن فہمی

رانا عبدالرزاق خاں

شعراء ہمیشہ کسی نہ کسی رنگ میں سخن فہمی عالم بالا معلوم شدہ کا نعرہ بلند کرتے چلے آئے ہیں۔اس نعرہ میں تو جھنجھلاہٹ ہے۔لیکن شعراء کے ہاں ایسے اشعار بھی بکثرت ملیں گے جس میں حرماں اور تحسر کا رنگ جھلکتا ہے۔جن کی بنا اَبنائے زمان کی ناقدر شناسی سخن ہے۔اس شکوہ شکایت کی تاریخ بہت قدیم ہے۔جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے۔فارسی کا کم وبیش ہر بڑا شاعر اس بات کا شاکی نظر آتا ہے کہ لوگ نہ سخن فہم ہیں نہ سخن شناس۔قدردانی ہو تو کس طرح ہو؟۔اردو شعراء کا بھی یہی حال ہے۔میرؔ سادگی میں سہل ممتنع کے مقام تک پہنچتے ہیں۔اس کے باوصف وہ بھی یہی کہتے سنائی دیتے ہیں۔کہ سخن فہم نہیں ملتے۔غالبؔ اور بیدلؔ نے تو خیر اس موضوع پر بہت سے اشعار لکھے ہیں۔حالیؔ نے بھی کہہ دیا۔

؎ کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

علوم مجلسی پر جن لوگوں نے مشرقی وضع داری اور آداب پر کتب لکھی ہیں۔وہ اس بات کے مدعی ہیں کہ سخن گوئی آسان ہے اور سخن فہمی مشکل۔یاد رکھیئے کہ غالب نے اپنے دیوان کی اشاعت سے پہلے سخن فہم دوستوں کی ایک مجلس بنائی تھی جس کے رکن نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بھی تھے۔انہی کے متعلق غالبؔ نے کہا ہے۔

نہ نو دشت دیواں درغزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد۔غالب کے لئے ایسا کہنا بڑی بات ہے اور شاید اس بات کی دلیل قاطع ہے۔کہ سخن فہمی کا مقام سخن گوئی سے بلند تر ہے۔مجلس مشاعرہ ہو یا کوئی اور محفل،شاعر کی نظریں ہمیشہ سخن فہم کی تلاش میں رہتی ہیں۔سخن فہم کے داد دینے کا انداز اسلوب،رسمی داد دینے والوں سے علیحدہ ہوتا ہے۔اور شاعر کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ اس شخص کی نظر حسن کلام کی باریکیوں اور اظہار کی نزاکتوں تک پہنچ رہی ہے۔سخن گوئی اس زمانہ میں پیچیدہ ہوتی جارہی ہے۔یوں بھی سخن گوئی کا عمل فنونِ لطیفہ میں سب فنون سے زیادہ پُراسرار،حیرت پرور اور پیچ دار ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ افکار،دل کی واردات،ذہنی تصورات،الفاظ کا جامہ پہننے سے پہلے کئی بار شاعر کی گرفت میں آتے ہیں اور نکل جاتے ہیں۔کبھی ردیف مانع اظہار ہوتی ہے کبھی قافیہ۔کبھی وزن کی پابندی،بہر حال تشکیل لفظی سے پہلے سخن گو کو عجیب عجیب منزلوں اور مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔پہلے وہ اس بات کا شعورِ کامل حاصل کرتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔جب یہ شعور حاصل ہو جاتا ہے تو ایک اُلجھن دور ہو جاتی ہے۔کہ سخن گو کو بقطع ویقین اپنی واردات ذہنی اور ان کی نوعیت کی دلالتوں کا علم ہو جاتا ہے۔لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔اب سخن گو کے سامنے،واردات کے اظہار کے لئے الفاظ کے انتخاب کا مرحلہ ہوتا ہے۔یہ بھی بہت ہی نازک اور پُراسرار مقام ہے۔پہلے تو یہاں شاعر کے مبلغ علم کا امتحاں ہوتا ہے۔ہوسکتا ہے کہ جو الفاظ اظہار کے لئے موزوں ہوں وہ شاعر کے پاس ذخیرہ الفاظ موجود ہی نہ ہو۔پھر یہ بھی ممکن ہے الفاظ تو ہوں مگر ان کے درست معنی شاعر کو معلوم نہ ہوں۔فرض کریں یہ دونوں تو ہوں مگر ترکیب استعمال کا پتہ نہ ہو۔اس منزل سے گزرا تو وارداتِ ذہنی نے الفاظ کا جامہ ضرور پہنا۔یعنی ذہن میں ابھی شعر وجود میں نہیں آیا۔کیونکہ ابھی یہ منزل باقی ہے۔کہ الفاظ کی ترتیب اور نشست کی کیا صورت ہو۔شعر اصلاً جس سماعت سے تعلق رکھتا

ہے اس لئے دل میں اترنے سے پہلے اسے درگوش پر دستک دینی پڑتی ہے۔ یہ مرحلہ بخوبی طے ہو جائے تو تو معنی تابناک کی عروسِ شرمگیں حجلہ الفاظ سے جھانکتے ہیں۔ جھانکنے کا لفظ میں نے جان کر استعمال کیا ہے۔ عروسِ معانی سے آنکھیں چار کرنا مشکل سے میسر آتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام مراحل طے کرنے میں کچھ پہلو تشنہء اظہار رہ جاتے ہیں۔ اور شاعر گویا پھڑکتا رہ جاتا ہے۔ کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اپنی پوری کوشش کے باوجود کہہ نہیں پایا۔ جس وقت معانی الفاظ میں مقید ہو چکتے ہیں۔ تب بھی الفاظ کی نشست اور معانی کی ترتیب بڑے شاعروں کے ہاں ایسی ہوتی ہے۔ کہ سننے والا بھی وہ مطلب اخذ کرتا ہے۔ جو مجموعہ الفاظ میں موجود نہیں ہوتا ۔لیکن جس پر الفاظ کی ایک خاص چیز دلالت کرتی ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل اشعار میں الفاظ کی ترتیب پر غور فرمایئے گا۔

یقیں مارا گیا جرم محبت پر، زہے طالع!

سعادت اسکو کہتے ہیں شہادت اس کو کہتے ہیں

سخن گوئی میں ایک مقام یہ بھی آتا کہ شاعر حقائق بیان کرنے کے لئے تشبیہات و استعارات کا دامن تھامتا ہے۔ معمولی تشبیہات و استعارات سے بحث نہیں بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ذہنی واردات کو جو شعر کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہیں دوسرے فنون لطیفہ کی اصطلاحات کے ذریعے سامع تک پہنچایا جاتا ہے۔ یہی نہیں سخن گوئی میں کم وبیش ہر بڑا شاعر کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ بعض تلمیحات پیش پا اُفتادہ ہوتی ہیں۔ اور بعض دقیق اور علوم وفنون کی اصطلاحات پر مبنی تلمیحات ہر طرح کی ہوتی ہیں۔ طب، ہیت، نجوم، تاریخ، فلسفہ، مذہب، فقہ، معانی شعر کے دام خیال سے کوئی چیز نہیں بچتی۔ فارسی میں خاقانی تلمیحات کی دقت کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہیں۔ اُردو میں اقبال کے ہاں جس کثرت سے تلمیحات ملتی ہیں۔ شاید اور کسی کے ہاں اس کی مثال نہ ملے۔ فلسفہ، حدیث، اور فقہ ان علوم کی طرف اقبال کا خاص میلان ہے۔ سخن فہم کا کمال یہ ہے کہ اس کا مطلب دریافت کرے۔ جو مقصود شاعر ہے سخن فہمی ان تمام اشارات ورموز کو سمجھنے کا نام ہے جو شاعر نے شعر میں مخفی رکھے ہیں۔ یوں سخن فہمی، سخن گوئی سے زیادہ دشوار ہو جاتی ہے۔ سخن فہمی کے لئے ذوق سلیم لازم ہے۔ ذوق سلیم کچھ مطالعہ کا، کچھ مشاہدے کا، کچھ محفل آرائی کا، کچھ تربیت کا، کچھ ذاتی اور اجتماعی ماحول کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کی انفرادیت یوں قائم رہتی ہے کہ غزل گوئی میں اثرؔ لکھنوی میرؔ پر جان دیتے ہیں۔ اور نیاز فتحپوری مومنؔ پر۔ لیکن نہ تو نیازؔ کو میرؔ کے شاعر ہونے پر انکار ہے اور نہ اثرؔ کو مومنؔ کے ناشاعر ہونے پر اصرار ہے۔ ہاں اگر کسی شاعر کے متعلق یہ جھگڑا کھڑا ہو جائے کہ یہ شاعر بھی ہے کہ نہیں اور جو لوگ مسلمہ طور پر ذوق سلیم رکھتے ہیں دو گروہوں میں بٹ جائیں گے۔ تو افسوس سے ایک گروہ کو مردود ٹھہرانا پڑے گا۔ کہ شعر یا شاعر کی خوبی میں بھی اختلاف رائے نہیں ہو سکتا صرف پسندیدگی کے مدارج ہو سکتے ہیں۔ شعر کی تعبیر میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ شاعر کے مالی رتبہ ہونے پر بحث ہو سکتی ہے یہ بات کبھی متنازعہ فیہ نہیں ہو سکتی کہ فلاں شعر اچھا ہے یا بُرا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ سخن فہمی، سخن گوئی سے زیادہ مشکل فن ہے۔ میرے خیال میں آپ میرے ہم نوا ہوں گے کہ یہ بات غلط نہ تھی سخن فہموں کی تعداد ہمیشہ شعراء کی تعداد سے کم تر رہی ہے اس لئے ان کی بڑی مانگ بھی رہی ہے۔ اور شعراء کے نام لے لے کر اپنے دیوانوں میں ان کو سراہا گیا ہے۔

اُردو ہے جس کا نام۔ عاصی صحرائی

اپنی زبان کس کو پیاری نہیں لگتی اس بارے میں طرف داری برحق لیکن سخن فہمی بھی ضروری ہے اُردو کی زُلف گرہ گیر کے ہم سب اسیر ہیں۔اُردو کی حسن وخوبی کا تذکرہ کون نہیں کرتا۔اس کے لطف واثر اورشیرینی کی کشش کون محسوس نہیں کرتا کون نہیں جانتا کہ اُردو برصغیر کی یا جنوبی ایشیا کی ایسی زبان ہے جس میں اَخذوقبول کا حیرت انگیز ملکہ ہے۔اور جس کا دامن رنگ برنگے پھولوں سے پُر ہے ۔اور جس کی جادواثری میں شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی اور نطق اعرابی تینوں کا ہاتھ ہے۔کون نہیں جانتا کہ اردو نے ہندآریائی کا دودھ پیا ہے اور اسی دھرتی پر پلی بڑھی ہے۔کون نہیں جانتا کہ جب نئی تاریخی حقیقتیں اُبھرتی ہیں۔تو نئے سماجی تقاضے پیدا ہوتے ہیں۔ اور نئی سچائیاں وجود میں آتی ہیں۔اردو ایسی ہی ایک سچائی ہے لسانی، سماجی، اور تہذیبی سچائی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے ساجھے اور اختلاط وارتباط سے وجود میں آئی۔اس وقت اس کا کوئی نام نہ تھا۔جب کوئی بھی سچائی جنم لیتی ہے اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔سچائیوں کو نام اس وقت ملتا ہے جب وہ خانہ زاد ہو جاتی ہیں۔دیوتاؤں کی دھرتی سے جب یہ نیا چشمہ پھوٹا اور اس میں عرب، فارسی، ترکی اثرات کا پیوند لگا تو اس کا کوئی نام نہ تھا۔ہندوستان کی ہر چیز ہندی تھی۔فارسی یائے نسبتی کے ساتھ۔اس طرح ہر زبان ہندی تھی۔امیر خسروؒ نے اسے ہندی بھی کہا اور دہلوی بھی ۔اسی زمانے میں جب راگ رنگ کی محافل میں اس کے نغمے سماں باندھنے لگے تو اسے ریختہ بھی کہا گیا۔دکن اور گجرات پہنچی تو دکنی اور گجراتی بھی کہلائی۔اور پھر کسی نے اردو کہا تو کسی نے ہندی ۔اور کسی نے کھڑی۔بنیاد وہی مگر راہیں الگ الگ ہوگئیں۔نام سے کیا ہوتا ہے لیکن یہاں نام ہی سے فاصلے بڑھے اور دوریاں بڑھیں۔اس امر کو تسلیم کرنے میں شاید کسی کو تامّل ہو۔کہ اردو زبان ہماری پچھلی کئی صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے۔ایسی کمائی کہ جس سے کوئی انصاف پسند نظریں نہیں چرا سکتا۔تاریخ کے سیل میں جب تہذیبیں بہہ جاتی ہیں اور نسلیں پگھل جاتی ہیں۔جب چہرے کے نقوش، پہناوا، رہن سہن، طور طریقے نئی شادیوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔جب گل وبلبل کا رشتہ نئی رنگینیوں کی خبر دیتا ہے جب کوئل کوکتی اور آم کے پیڑوں پر بُور آتا ہے جب دلوں کے دروازے وا ہوتے ہیں فصل کے فاصلے دُھل جاتے ہیں۔اور وصال کے در کھلتے ہیں ایسے میں زبانیں قوموں اور نسلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہیں۔اور محبت و یگانگت کے رشتے استوار ہوتے ہیں۔تاریخ کے ایسے لمحات میں جب تہذیب کی ہوا میں نشے کی تاثیر اور لطافت مزید پیدا ہو جاتا ہے۔تو محبت کے دو بول سنانے اور قلب وروح کو سرچار کرنے کے لئے کوئی اردو زبان پیدا ہوتی ہے۔اردو کو محض اردو کہنا اسے صرف ایک زبان کہنا اس کی درجہ مندی کرنا اردو کے ساتھ بے انصافی ہی نہیں پوری ہندوستانی تہذیب اور ہزار سالہ تاریخ باہمی میل ملاپ اور برصغیر کے خوابوں ،امنگوں، امیدوں، ولولوں کی توہین بھی ہے۔اہل نظر جانتے ہیں کہ اردو جینے کا سلیقہ اور بولنے کا ایک طریقہ بھی ہے۔اردو محض زبان نہیں ایک طرز زندگی، اسلوب زیست بھی ہے اور مشترکہ تہذیب کا وہ ہاتھ بھی جس نے ہمیں گھڑا، بنایا اور سنوارا ہے۔اور وہ شکل دی ہے جیسے آج ہم اپنی پہچان کی ایک منزل سمجھتے ہیں۔درباروں سے اردو کا رشتہ بڑا معنی خیز ہے اردو نے درباروں سے نہیں بلکہ خود درباروں نے اردو سے رشتہ پیدا کیا اردو بازاروں، گلیوں، کوچوں، میلوں، ٹھیلوں، جوگیوں ، سنتوں، فقراء اور صوفیاء کی زبان ہے۔انہی جوگیوں، سنتوں، فقراء اور

صوفیاء نے اسے قریہ قریہ، شہر شہر پھیلایا۔اور سورج کی کرنوں کی طرح یہ جہاں جہاں پہنچی آنکھوں میں بستی اور دلوں کو شاداب کرتی چلے گئی۔اس کی پشت پر ہمیشہ انسان دوستی، وسیع النظری اور محبت اور یگانگت کا وہ تصور رہا۔جس سے قومیں عروج پاتی ہیں۔اور تاریخ میں ان کے نقوش جگمگاتے رہتے ہیں۔یہی وہ زبان ہے جس میں جوگیوں، سنتوں، فقراء اور

صوفیاء، اولیا، نے توحید کے ترانے گائے۔خواجہ معین الدین چشتیؒ ہوں یا حضرت فرید الدین گنج شکرؒ یا حضرت نظام الدین اولیاءؒ ہوں یا خواجہ بندنواز گیسودراز، رامانند ہو یا تسکا رام کبیر ہو یا گرو نانک سینکڑوں جوگیوں، سنتوں، فقراء اور صوفیاء نے اس زبان کے سر پر شفقت اور دعاؤں کا ہاتھ رکھا۔

خواب آنکھوں میں ٹوٹ جاتے ہیں

سہیل احمد لون کی شاعری

جناب عابد حسین عابد سیکٹری جنرل انجمن ترقی پسند مصنفین پیجاب لاہور سہیل احمد کی کتاب ''خواب آنکھوں میں ٹوٹ جاتے ہیں'' کے متعلق رقم طراز ہیں کہ:۔''جس طرح بارود، کائنات، یادیں، محرومیاں، دُکھ، وطن سے محبت اور دوری کے احساس پر مشتمل ہے۔ہم اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔کہ آسمانوں، خلاؤں، یا اَن دیکھی دنیاؤں کی دریافت سہیل احمد کا مطمح نظر نہیں۔وہ جس زمین کا باشندہ ہے وہ اسی کو خوبصورت بنانے کے خواب دیکھتا ہے ایک زندہ شخص کی آنکھوں میں خواب ٹوٹ تو ضرور سکتا ہے مگر اس کا زندہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ٹوٹے خواب کو جوڑ کر ایک نیا خواب تشکیل دینے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔دراصل سہیل احمد کی شاعری اور نثر پارے ٹوٹے خواب کو جوڑنے کی کوشش ہے۔جسے اس نے متاثر کن بیانیے کے ساتھ بڑی ہنرمندی سے بیان کیا ہے''۔عابد حسین عابد سیکٹری جنرل انجمن ترقی پسند مصنفین پیجاب لاہور

عبیداللہ علیم

وہ رات بے پناہ تھی، اور میں، غریب تھا

دن بھر محنت کرنے والے وقتی سوگئے سارے
لوگ
سفرطویل جو کرکے آئے بیٹھ گئے ستانے کو
تیز قدم تھے جن کے آگے نکل گئے ہیں سارے لوگ
ظفر تو اب کیا ڈھونڈ رہا ہے ذرا ہوش کے ناخن لے
دن چڑھا اور رات گئی جب چھپ گئے چاند ستارے لوگ

سہیل احمد لون

وہ جس سے بہت دیر میں بیگا نہ ہوا ہوں
میں آج اسی شخص کا دیوانہ ہوں
جادو سا عجب مجھ پہ محبت نے جگایا
وہ شمع بنے اور میں پروانہ ہوا ہوں
دیکھا جو نظر بھر کے اسے غور سے میں نے
خود اپنی ہی ہستی سے بیگانہ ہوا ہوں
اس پیار کا اے دوستو نشہ بھی عجب ہے
سر مستی میں اُس کے لئے مستانہ ہوا ہوں
گزرا ہوں سہیل ایسے مراحل سے تو اکثر
کعبہ میں ہوا ہوں کبھی بت خانہ میں ہوا ہوں

منور احمد کنڈے

ہر امیر تنہا اور ہر غریب تنہا ہے
ہر ایک شخص اٹھائے صلیب تنہا ہے
کسی کے غم میں نہیں ہے شریک اب کوئی
ہر مریض تنہا اور ہر طبیب تنہا ہے
بتا رہا ہے زمانے کو ہر تماشائی
کہ اپنی جنگ میں لڑتا ادیب تنہا ہے
کسے بتائیں رفاقت ہے کیا رقابت کیا!
رفیق تنہا ہے گھر میں رقیب تنہا ہے
یہی ثبوت ہے یارو کہ ہم بھی ہیں یکتا
جہان میں ہمارا حبیب تنہا ہے
زبان والے منور ہزار ہیں لیکن
اس سرائے میں تُجھ سا نقیب تنہا ہے

اقبال اشعر

اردو مرا نام ہے میں ہوں خسرو کی پہیلی
میں میر کی ہمراز غالب کی سہیلی
دکن کے ولی نے مجے گو دی میں کھلایا
سودا کے قصیدوں نے مرا حسن بڑھایا
ہے میر کی عظمت کہ مجھے چلنا سکھایا
میں داغ کے آنگن میں کھِلی بن کے چنبیلی
اردو ہے مرا نام ہے میں ہوں خسرو کی پہیلی
غالب نے بلندی کا سبق مجھ کو سکھایا
حال نے مروت کا سبق یاد دلایا
اقبال نے آئینہ حق مجھ کو دکھایا

مومن نے سجائی میرے خوابوں کی حویلی
اردو ہے مرا نام ہے میں ہوں خسرو کی پہیلی
ہے ذوق کی عظمت کہ دیئے مجھ کو سہارے
چکبست کی الفت نے میرے خواب سنوارے
فانی نے سجائے مری پلکوں کے سہارے
اردو ہے مرا نام ہے میں ہوں خسرو کی پہیلی
کیوں مجھ کو بناتے ہو تعصب کا نشانہ
میں نے تو کبھی خود کو مسلماں نہیں جانا
دیکھا تھا کبھی میں نے خوشیوں کا زمانہ
اپنے ہی وطن میں ہوں آج اکیلی
اردو ہے مرا نام ہے میں ہوں خسرو کی پہیلی

مضطر عارفی

کچھ تو دنیا بھی آنی جانی لگی
کچھ یار کی گلی سہانی لگی
ان کی ہر بات کا یقیں آیا
ان کی ہر بات سہانی لگی
ان کا غصہ ہے پیار سے بڑھ کر
ان کی سختی بھی مہربانی لگی
ان سے مل کر بدل گئی ہر چیز
عمر فانی بھی جاودانی لگی
اک قیامت گزر گئی دل پر
سننے والوں کو اک کہانی لگی
سر جھکا کر جو غور سے دیکھا
ہر نئی آرزو پرانی لگی
ترے غم کے وغیر مضطر کو
کتنی بے کار زندگانی لگی

مرزا محمد افضل کنیڈا

میری ہر آہ میں دہائی میں
قید ہی قید تھی رہائی میں
جس قدر تھے حجاب، اُٹھنے لگے
ایک لمحے کی آشنائی میں
یار سے ہمکلام رہتا ہوں
وصل میں کبھی جدائی میں
میرا دامن تھا تار تار بہت
میں نہاں ہو گیا خدائی میں
قید میں جی کئے خوشی سے ہم
دم نکل جائے گا رہائی میں
میں وہ لمحے تلاش کرتا ہوں
کھو دیئے جو تیری جدائی میں
ہو عطا شرف آگہی مجھ کو
میرے نالوں کی بے نوائی میں

ان کی محفل بہار کی سی ہے
پھول جھڑتے ہیں لب کشائی میں
غیر کا تھا نہ کچھ قصور اس میں
یہ لڑائی تھی بھائی بھائی میں

مشکل کُشا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے ۔رانا بلال افتخار

میں نے زمین سے اپنے غم کی بات کہنا چاہی۔تو زمین خود ہی اپنے غم واندوہ سے لرزنے لگی۔زمین کو پست حوصلہ جان کر آسمان سے رجوع کرنا چاہا کہ یہ تو بلند حوصلہ ہوگا۔لیکن آسمان مجھے اپنا ہی غم سنا کر بارش کی صورت میں رونے لگا۔میں نے پھر حوصلہ کر کے ستاروں سے اپنے کرب کا اظہار کیا تو تارے آسمان کی وسعتوں میں گُم ہونے لگے۔جب چاند سے اپنی بات کہی تو چاند بھی بادلوں میں منہ چھپانے لگا۔میں نے چاند سے پھر التجا کی تو اس نے مجھے اپنے سینے کے داغ دکھا دیئے۔کہ دیکھ میں بھی تیری طرح داغ رکھتا ہوں۔پھر میں پریشان ہو کر درختوں کے پاس گیا کہ شاید یہ میرے غم کا بوجھ ہلکا کر دیں۔میری داستان سُن کر کہنے لگے کہ ہم بھی تو مظلوم ہیں میرے ان زرد پتوں سے ہماری داستان غم سُن دیکھو۔پھر بھی تمہیں ان خزاں رسیدہ پتوں میں پناہ مل سکتی ہے تا کہ لوگوں کے قدم تجھے روندتے رہیں۔پھر بھی میری تسلّی نہ ہوئی تو آخر کار پھول کے پاس گیا اس سے اُس سے اس کا حال پوچھا تو انہوں نے طنزیہ لہجے میں ہنس ہنس کر بولا" کٹ رہی ہے زندگی ان چبھتے ہوئے خاروں میں۔**ناک کی اقسام** ۔

تاریخی ناکوں میں دو ناکیں بہت مشہور ہیں۔ایک ناک تو وادی نیل کی معشوقہ قلوپطرہ کی تھی۔جس کے متعلق یہ دیر تک سوچا جاتا رہا کہ اگر یہ ایک انچ کا آٹھواں حصہ بڑی ہوتی تو عیسائیوں کی تاریخ و تمدن باالکل مختلف ہوتی۔قلوپطرہ کی اس تاریخی ناک کو حیرت ناک کہتے ہیں۔کیونکہ اس کے تصور سے ہی لوگ ورطہ حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ ایک عورت کی ناک قوموں کی قسمت میں نکیل ڈالنے کا باعث کیونکر ہو سکتی ہے۔دوسری ناک کو ہولناک کہتے ہیں۔یہ بھی مصر ہی کی پیداوار ہے اور ابوالہول کے سنگین چہرے پر حضرت مسیح کی پیدائش سے بہت پہلے کی بیٹھی ہوئی ہے۔تشویش ناک بہت ہی کم دیکھنے میں آتی ہے۔لیکن جب نظر آجائے تو بعض دیکھنے والوں کو بہت تشویش پیدا ہو جاتی ہے۔سنکتے وقت جو ناک بہت شور مچائے وہ شورش ناک کے نام سے مشہور ہو جاتی ہے۔نم ناک سے تو ہر ایک کو واسطہ پڑ جاتا ہے۔نزلے اور زکام کی حالت میں اچھی، اچھی سے طرب ناک نم ناک بن جاتی ہے۔شرم سے عام طور پر انسان کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔لیکن اگر شرم کا احساس بہت ہی شدید ہو تو ناک پر بھی پسینے کی بوندیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ایسی ناک کو شرمناک کہا جائے گا۔اور وہ ناک جس کے تصور سے ہی خوف و ہراس طاری ہو جائے۔وہ خوف ناک کہلانے کی مستحق ہے۔چکنی اور چمکیلی ناک کا شمار خاندانی ناکوں میں نہیں ہوتا۔ان کی چکناہٹ اور چمک دور کرنے کے لئے آئے دن دوائیں ایجاد ہوتی رہتی ہیں۔ایسی ناک کو تابناک کہتے ہیں۔اسلئے کہ دوسری غیر چمکیلی ناکیں ان کی تاب نہیں لا سکتیں۔**بچوں کا نام رکھنا ایک معمہ ہے**۔بچہ پیدا ہو تو سب سے پہلے یہ استفسار کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ وہ کس پر گیا ہے۔ننھیال پر یا ددھیال پر۔اس کے خدوخال چچیرے ہیں ہمیرے ہیں یا خلیرے۔کوئی ناک باالکل باپ کی بتائے گا۔کوئی ہو بہو ماں کی۔اور کوئی اسے خالہ کے بھائی کے باپ کے چچا کے

دادا کی ناک سے جا ملائے گا۔ پھر جب اس کے نام رکھنے کا مرحلہ آتا ہے۔ تو اس بچے کے دادا، نانا، چچا اور دیگر قریبی رشتہ دار اس میں اکثر مخل ہوتے ہیں۔ اولاد کا نام مقرر کرنے میں بعض اقات اس گھبراہٹ، عجلت اور اُلجھن کے علاوہ توہم پرستی کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اگر لڑکا یا لڑکی بہت دیر کے بعد اور بڑی منتیں ماننے کے بعد پیدا ہوئے ہیں تو اس کا نام بھی اُسی مناسبت سے رکھا جاتا ہے۔ مثلاً اگر لڑکا ہے تو اللہ دتہ، پیراں دتہ، اللہ ودھایا، اللہ وسایا، خدا بخش، نبی بخش، غوث بخش، میراں بخش، لڑکی ہو تو اللہ رکھی، پیراں دتی، خیراتن، حیاتن وغیرہ۔ اگر بہت سے بچے مرنے کے بعد اللہ نے لڑکی یا لڑکا دیا ہے تو اس کا نام اللہ جوایا، رُلدو، گھسیٹا، مہنگا، کلن، کلوا، کلب علی وغیر رکھتے ہیں۔ نام چننے

کے سلسلے میں والدین بہت دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ قرآن سے فالیں تیار کی جاتی ہیں۔ زائچے تیار کرائے جاتے ہیں۔ نجومیوں اور جفاروں سے رجوع کیا جاتا ہے۔ پیروں فقیروں سے رائے طلب کی جاتی ہے پھر کہیں جا کے مناسب نام ملتا ہے

پٹاخے۔ نفسیات کے ماہرین بڑی تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ کہ خوشی کا پُر جوش مظاہرہ کرنے کے لئے پٹاخے چھوڑنا اور آتشبازی چلانا انسان کی جبلت ہے۔ شروع شروع میں درندوں کو ڈرانے کے لئے پٹاخے اور آتشبازی ایجاد ہوئی۔ لیکن بعد میں جب انسان درندوں کا بھیس بدلنے لگے تو یہ پٹاخے اور آتشبازی گولوں، بموں، جدید اسلحہ کی شکل اختیار کر گئیں۔

طنز و مزاح۔۔۔ دھوتی (تہبند) ابن لطیف

دھوتی ہمارے کلچر اور ایگریکلچر کا جاذبِ نظر سنگم ہی نہیں سرمایہ بھی ہے

دیکھا جائے تو اس کا وجود ہی ''دھوتی'' کا مرہون منت ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انسان کا ابتدائی اور اولین رابطہ درخت سے ہوا۔ جس کے پھلوں پر اس نے گزر اوقات کی ستر پوشی کا احساس دامن گیر ہوا تو اس نے درخت کے پتوں، شاخوں اور شال کو اپنی کمر کے گرد لپیٹ کر دائرہ نما پیراہن کی بنیاد رکھی۔ جس کے بارہ میں میر تقی میر نے'' پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے رے'' میں بلیغ ارشاد کیا ہے ۔لیکن آہستہ آہستہ جب انسان شعوری سطح پر بالغ نظر ہوا تو اسے لا محالہ نہ صرف اپنے بے سنگم لباس پر ندامت ہوئی بلکہ کسی غیر موزوں انسانی لباس کا شدت سے احساس بھی ہوا۔ جس پر اس نے اپنے گرد و نواح پھیلے ہوئے قدیم کرم فرماء درختوں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ جس پر شجرِ شہتوت نے ڈھارس بندھوائی۔ اور اس کے خوشہ چین ریشم کے کیڑوں نے خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ریشم کے دھاگوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگ گئے۔ اور یوں ریشم کا دھاگہ بڑے کروفر سے انسان کے ابتدائی لباس کو بہتر اور ارتقائی صورت '' دھوتی'' کو منصۂ شہود پر لے آیا جسے آج بھی صدیوں پرانے حوالے سے عوام میں تہبند (لک دی) کے نام نامی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انسان اپنے زعم میں خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس نے اپنوں پر سبقت لے جانے اور غیروں پر برتری جتانے کی خاطر پاجامہ پھر چوڑی دار پاجامہ پھر شلوار۔ پتلون اور رنگ رنگ کے تنگ و شوخ و شنگ لباسوں میں اپنی امان ڈھونڈنا شروع کر دی۔ اور یوں اس کے چنگل میں پھنس کر دھوتی کو حقارت کی نظروں سے دیکھنا اپنا شعار بنا لیا۔ جس سے دھوتی کا داخلہ بڑے بڑے کلبوں بڑے بڑے ہوٹلوں، یونیورسٹیوں، حتیٰ کہ اسمبلیوں تک میں ممنوع قرار دے دیا گیا

۔ایک مخصوص طبقے نے تو اسے گنواروں کی پوشاک ثابت کرنے کا عزم کرلیا۔ بلکہ اب تک ''دھوتی'' عرف ''لاچا'' کو ماجھے ساجھے کا لباس ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کررہے ہیں۔لیکن ان منفی حربوں سے نہ دھوتی دل برداشتہ ہوئی اور نہ اس کے زمین دوز عوامی راستے ہی ختم کئے جاسکے ہیں۔ چنانچہ آج بھی عوامی سطح بھاری آبادی کی اکثریت دھوتی پر دل و جان سے فریفتہ ہے بلکہ اکثر خواص بھی سرکاری و نیم سرکاری اور نجی فرائض انجام دینے کے بعد جوں ہی اپنی اقامت گاہوں میں آتے ہیں ۔تو سب سے پہلے تنگ پوشاکوں کو بے پرواہی بلکہ بے دردی سے ادھر اُدھر پھینک کر دھوتی کے جلو ہی میں سُکھ کا سانس لیتے ہیں ۔دھوتی کی عظمت کا میں ہی معترف نہیں اس کے پرستاروں میں کئی نامور شخصیات اور صفِ اول کے قائدین بھی شامل ہیں۔اس سلسلہ میں علامہ اقبال کی مثال سامنے ہے۔جنہوں نے یورپ کی زمستانی ہواؤں میں نہ تو آدابِ سحر خیزی سے کنارہ کشی اختیار کی۔اور نہ دھوتی کو ترک کیا۔اور اس قومی لباس کے فروغ کے لئے کمر بستہ رہے۔یوں اگر دھوتی کو کمر بستہ کا اعزازی نام بھی دے دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ ہر لحاظ سے موزوں ہے۔اور اس طرح علامہ اقبال کی روح کے بھی شاداں وفرحاں ہونے کا امکان ہے۔جنہوں نے یورپ سے واپسی پر تادمِ واپسیں اس سے پیمانِ وفا باندھا اور گھر کی چار دیواری کے اندر چارپائی پر دراز ہوکر پڑھتے رہے۔سرنگوں ہوکر غور و فکر کرتے رہے۔شعر خوانی یا شعر گوئی کے لئے آلتی پالتی مار کر بیٹھنے اور اور سیاسی گتھیوں کو سلجھاتے رہے اور سیاسی شعبدہ بازوں کے بہکانے سے بچتے رہے دھوتی ان کی راہ میں کبھی مخل یا مزاہم نہیں ہوئی ۔انہوں نے نہ صرف انگریزی لباس کا کھلم کھلا بائیکاٹ کر کے دھوتی کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔ جب سیاسی مذاکرات کے لئے انگلستان گئے تو فرنگی آقاؤں کو ان کی دھوتی کے آگے سرنگوں ہوکر بکنگھم پیلس کے قواعد وضوابط میں ترمیم کرنا پڑی اور مہاتما جی کی پیروی میں اور ان کی اشیر باد حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے لوگ دھوتی پوش ہو گئے ۔ بلاشبہ دھوتی ان کے ناقابل فراموش احسان کے مترادف ہے اور شاید ۔۔ قیس سا پھر نہ اُٹھا کوئی بنی عامر میں ۔۔۔۔۔۔۔اس طرح اس انداز کا دھوتی کا کوئی اور فدا کار پیدا نہ ہوا۔اصل میں یہ دونوں دھوتی پوش وہ تھے جو اپنی اپنی قوم کے لئے بیش بہا قربانیوں سے دریغ نہیں کرتے تھے ۔اور طبعاً SIMPLE LIVING AND HIGH LIVING کے شائق تھے۔جن کی دوررس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ امپورٹڈ قیمتی لباس کے مقابلہ میں دھوتی جیسے لباس کا کوئی نعم البدل نہیں۔دھوتی میں بناوٹ اور تصنع کا شائبہ تک نہیں۔ یہ معمولی سے معمولی شخص کی دسترس میں ہے اس کا اکلوتا فیض کیا یہی کم ہے کہ درزی کے منہ مانگے داموں اور پھیروں سے بچاتی ہے۔دھوتی باندھ کر انسان کا جسم دو حصوں میں منقسم نہیں ہوتا ۔ورنہ شلوار، پاجامہ، پتلون تو ٹخنوں سے لے کر کولہوں تک انسانی شخصیت کو دو علیحدٰہ خانوں میں تقسیم کر دیتے ہیں جبکہ دھوتی کے گھیراؤ اور پھیلاؤ میں یکسانیت ہے ۔حشرات الارض کا کوئی نمائندہ کسی دھوتی کے اندر گُھس جائے تو دھوتی جھاڑتے ہی نو دو گیارہ ہوجاتا ہے۔لیکن اگر جرات رندانہ کر کے پتلون، شلوار یا پاجامے میں گُھس جائے تو پھر تگنی کا ناچ نچاتا ہے دھوتی حفظانِ صحت کے عام اصولوں کے عین مطابق ہے ۔اور روشنی کا انصرام کرنے میں یکتا ہے اور اس کا ریموٹ کنٹرول سراسر دھوتی پوش کے ہاتھوں میں ہے۔ جب چاہا کھسکا لیا آگے پیچھے سرکا لیا یا اوپر چڑھا لیا۔دھوتی استری سے بے نیاز ہوتی ہے اس کی معمولی شکنیں چارپائی پر لوٹ پوٹ ہونے سے ہی دور ہو

جاتی ہیں۔دھوتی وہ لباس ہے۔"یہ دو جامہ ہے کہ جس کا نہیں الٹا سیدھا" آنکھیں بند کر کے جس طرف سے بھی باندھ لیا جائے دھوتی پوش نشانہ تضحیک نہیں بن سکتا۔جیسا کہ پتلون، پاجامہ یا شلوار کو الٹا پہننے سے ہوتا ہے۔ہمارے روزمرہ کے معمولات میں دنگہ فساد کے واقعات اور فلموں میں لڑائی مار کٹائی کے خوفناک مناظر دھوتی پوشوں کے دم قدم سے ہی قائم ودائم ہیں۔بڑھکیں مارنے، بکرے بلانے میں انہی کا ہراول دستہ دکھائی دیتا ہے۔آتشیں اسلحہ کے بے دریغ استعمال میں یہی طبقہ پیش پیش ہوتا ہے۔تھانوں اور عدالتوں میں ایسے دھوتی پوشوں کو دیکھ کر اکثریت کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔میلوں ٹھیلوں کی رونق دوبالا کرنے میں تہبند یا تہمد کے پجاری ہی تو ہیں جو بڑے اہتمام اور شان دلربائی سے لڈیاں مارتے بھنگڑے، بولیاں سناتے، گاہلڑ نچاتے اور ماہیے کے سریلے بول الاپتے ہیں۔اگر یہ طبقہ نہ ہو تو عوامی میلے ہی پروانہ رخصتی لے جائیں۔دھوتی کی ڈب سگریٹ کے لئے موزوں ترین جگہ ہے۔ویسے یہ ڈب عمرو عیاری زنبیل نہ سہی "گنوں کی تھیلی" ضرور ہے۔چھوٹے موٹے ہتھیار از قسم پستول، خنجر، چاقو اور نوٹوں کے بنڈلوں کے بنڈل کے لئے ڈب سے زیادہ اور کوئی محفوظ ترین جگہ نہیں۔بسوں کے اڈوں، ریلوے اسٹیشنوں، بلکہ بسوں کے اندر اور مساجد کی دیواروں پر لکھا ہوتا ہے کہ "جیب کتروں سے ہشیار رہیں"، لیکن ڈب کتروں سے

ہشیار رہنے کی آج تک کسی نے تلقین نہیں کی۔بعض من چلے ڈب میں کبوتر، بٹیر وغیرہ قیمتاً، عاریتاً یا کھسکا چرا کر بڑے تفاخر سے لاتے دیکھے گئے ہیں۔وہ حضرات جو دھوتی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہیں اور اس پر معتوبِ شاہی کی مہر ثبت کرانے کے درپے ہیں ان کے محاسبہ کے لئے دھوتی پوشوں کو ٹھوس قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔اور دھوتی کی ساکھ کے لئے اظہار تکریم کی فضا تیار کرنے اور نئے سرے سے اس کی اہمیت جتانے اور اس کی حیثیت کا تعین کرنا ضروری ہے کیونکہ دھوتی ثقافت کی جان ہی نہیں تہذیبی عوامل کی پہچان بھی ہے۔جس کے بغیر یوسف بے کارواں کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔دھوتی کے بہی خواہ برصغیر ہی میں نہیں، برما، انڈونیشیا، ملائشیا اور عرب ممالک میں بھی پھیلے ہوئے ہیں۔دھوتی کے کا مختار اور پرستار اسے عالمی لباسوں میں شامل کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں ورنہ دھوتی کا مستقبل مشکوک رہ جائے گا۔دیکھیں کون سر پھرا دھوتی کا پرچم بنا کر سر بکف اور کفن بر دوش نکلتا ہے۔

برسات کی رات

امجد مرزا امجد (افسانہ)

وہ غسل خانے میں تھا۔کہ اسے شیداں کی آواز سنائی دی۔۔۔۔کہ "کھانا رکھ دیا ہے اور میں جا رہی ہوں۔" اسے فوراً یاد آیا کہ اسے تنخواہ بھی دینی ہے۔اس نے وہاں سے ہی آواز دی کہ ذرا ٹھہرو۔۔پیسے لیتی جاؤ۔۔۔پھر شاور بند کیا اور جلدی سے کمر پر تولیہ باندھ کر باہر نکل آیا۔شیداں اس وقت تک کمرے میں آ چکی تھی۔اور دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔باہر سخت بارش ہو رہی تھی۔شیداں دروازے تک جا کر لوٹی تھی۔اس کی پتلی سی قمیض گیلی ہو کر جسم سے چمٹ گئی تھی۔ریاض نے اپنے جسم سے ٹپکتا ہوا پانی جھٹکا اور ایک ہاتھ سے چہرہ صاف کیا اور۔۔۔۔۔۔دوسرے ہاتھ سے تولیئے کو پکڑ لیا تا کہ۔۔۔۔اور وہ کھسیانہ سا ہو کر مسکرایا۔۔۔"معاف کرنا شیداں! مجھے ڈر تھا کہ تم پیسے لئے بغیر نہ چلی جانا۔۔۔۔۔۔اس لئے میں جلدی میں نکل آیا۔دیکھو تم بھی بھیگ گئی ہو۔۔۔۔تھوڑی دیر رک جاؤ۔۔۔۔۔۔۔"بارش رکے تو میں

تمہیں موٹر سائیکل پر چھوڑ آؤں گا''۔وہ اپنے بستر کے قریب گیا ۔اور اس پر رکھی ہوئی پتلون کی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی ۔اسے بھی آج ہی تنخواہ ملی تھی ۔۔۔۔۔۔۔وہ ہاتھ میں سوسو کے پانچ نوٹ لے کر پیچھے کی طرف گھوما تو۔۔۔۔اس کے منہ سے بے اختیار۔۔۔اوہ۔۔۔نکل گیا۔۔۔۔۔۔شیداں سحر زدہ حالت میں کھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ اس کے ساتھ ٹکرا گئی ۔وہ نہ جانے کیسے قریب آ گئی تھی ۔اس نے اسے سنبھالنا چاہا۔اور ایک ہاتھ سے سرخ سرخ نوٹ فضا میں بکھر گئے ۔اور دوسرے ہاتھ سے پکڑا ہوا تولیہ نیچے جا گرا۔بے خیالی سے شیداں کے بازوؤں پر اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو گئے ۔تین برس سے تپ دق میں مبتلا رہ کر مرے ہوئے خاوند کی بیس سالہ بیوہ جس نے آج پہلی بار ریاض کے خوبصورت سفید سفید جسم پر پانی کی بوندیں چمکتی ہوئیں دیکھیں تو اس کو اپنے سانسوں پر اختیار نہ رہا۔اس کے ماتھے پر بارش کے قطرے چمکنے لگے ۔اور ململ کی میلی سی قمیض میں گرفتار جوان ابھرا ہوا سینہ باغی ہونے لگا جیسے پھٹ کر باہر آ جائے گا ۔ریاض کی انگلیوں کی سختی سے اسے جیسے نشہ ہونے لگا اور وہ بے خودسی ہو کر اس کے سینے سے چمٹ گئی ۔باہر زور سے بجلی کڑکی اور سارے بادل کمرے میں چھا گئے ۔ریاض کا باپ بچپن میں مر گیا تھا۔ماں نے زمین بیچ کر اسے بی اے کرایا ۔لڑکا محنتی تھا۔اس نے ساتھ ہی کمپیوٹر کا کورس بھی جاری رکھا ۔اور آج ایک اچھی ملازمت پر تھا ۔مگر ماں یہ دن نہ دیکھ سکی ۔بڑا سا مکان تھا جس کے اوپر کا حصہ کرائے پر اٹھا رکھا تھا ۔اچھی خاصی آمدن تھی ۔محلے کے کئی گھرانوں سے اشارتاً رشتوں کی دعوت آئی ۔مگر اس نے ابھی ایسا سوچا نہ تھا۔کچھ دنوں سے شیداں دوپہر کو آ کر گھر کی صفائی کرتی ،کھانا وغیرہ بنا کر اس کے آنے سے کچھ دیر پہلے رکھ جاتی ۔آج کپڑے دھونے سے کچھ دیر ہو گئی ۔اور اس دوران ریاض بھی آ گیا تھا۔مگر دو جوان جسم ٹکرائے بجلی کڑکی ، بادل گرجے اور فضا دھندلا گئی ۔اور اس قدر طوفان اٹھا کہ دونوں کو بہا کر لے گیا۔پھر رات گئے تک وہ ڈوبتے رہے ۔ابھرتے رہے ۔جل تھل ایک ہو گیا ۔برسوں کی پیاسی زمین سیراب ہو گئی ۔بارش کے بعد ایک دم سکون چھا گیا۔ہر چیز گیلی گیلی نکھری نکھری نظر آنے لگی ۔بارش رک گئی تھی باہر کا طوفان تھم گیا تھا اور اندر کا بھی ۔انگ انگ میں نشہ بھرا۔وہ تھکی ٹوٹی ہوئی مشکل سے اٹھی ۔کمرے میں اندھیرا تھا۔کپڑوں کی سرسراہٹ ہوئی اس نے جھک کر ریاض کے بکھرے بالوں کو اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے سنوارا۔اس کی پیشانی پر اپنے سلگتے ہوئے ہونٹ رکھ دیئے ۔تھرتھراتے ہوئے ہونٹ کانپ کر رہ گئے ۔وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی ۔ریاض مسکرایا۔روشنی جلائی ۔وہ چادر اوڑھ کر بستر پر ہی بیٹھا رہا اور اس کا ہاتھ تھامے کچھ دیر دیکھتا رہا ۔مسکراتا رہا۔پھر ساتھ پڑی نوٹوں کی گڈی سے سوسو کے پانچ نوٹ اور نکالے اس کے ہاتھ میں دیئے ۔اس کے چہرے پر بدستور مسکراہٹ ناچ رہی تھی ۔وہ بولا شیداں کل سے تم کام پر مت آنا۔ تمہاری نوکری آج سے ختم ہو گئی ہے ۔شیداں نے اسے ہونٹ بھینچ کر قہر بھری نظروں سے دیکھا۔اس کی آنکھوں میں گھٹا بھر آئی ۔رندھی ہوئی آواز میں بولی ۔غلطی میری تھی ۔سزا بھی مجھے ملنی چاہیئے ۔پھر اس نے سسکی لی ۔تم امیر لوگوں کا تو کام ہی غریبوں کی عزت لوٹنا ہے ۔مگر کیسے مرد ہو ایک ہی دن میں جی بھر گیا۔کچھ دن اور لوٹ مار کر لیتے ۔ابھی تو اس خزانے میں بہت کچھ تھا۔یہ کہہ کر اس نے نوٹ اس کے منہ پر مارے اور روتی ہوئی چلی گئی ۔ریاض کی ہنسی صحن تک اس کا پیچھا کرتی رہی ۔دوسرے روز صبح سویرے پہلے وہ شیداں کے گھر جو کچھ فاصلے پر ایک پرانے محلے میں تھا۔اپنا

موٹر سائیکل اس کے خستہ سے گھر کے سامنے کھڑا کیا اور بغیر کنڈی کھٹکائے کھلے ہوئے دروازے سے اندر چلا گیا۔شیداں باپ کے لئے روٹی بنا رہی تھی ۔جو قریب ہی زمین پر بچھی بوری پر بیٹھا چائے کے ساتھ پراٹھا کھا رہا تھا۔شیداں ایک موٹا سا پراٹھا مجھے بھی بنا دو۔ساتھ سالن ہو تو دے دینا۔میں چائے کے ساتھ پراٹھا نہیں کھاتا۔اور یاد رکھو! آگے سے میں ٹھنڈی روٹیاں نہیں کھاؤں گا۔ماں مجھے توے سے اتار کر گرم گرم روٹی کھلایا کرتی تھی ۔ شیداں کی آنکھیں اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھیں۔منہ کھلا ہوا اور سانس جیسے رک گیا تھا۔توے پر روٹی جل رہی تھی۔پھر ریاض نے اس کے باپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا چاچا میری نہ ماں ہے نہ باپ نہ بہن نہ بھائی۔جو تجھ سے آ کر شیداں۔۔۔اوہ۔۔۔رشیدہ کا رشتہ مانگتے ۔لہذا یہ کام بھی مجھے ہی کرنا پڑا۔یہ لو دس ہزار روپے۔اچھے سے کچھ جوڑے اور ہلکا سا سیٹ خرید لینا۔اسے بھی ساتھ لے جانا جو بھی یہ پسند کرے۔اور تیاری کیا کرنی ہوگی۔سب بیکار رسم ورواج ہیں۔مگر ایک شرط ہوگی۔اس کے جہیز میں تم ساتھ آؤ گے۔تا کہ جب میں دفتر جاؤں یہ اکیلی نہ ہو۔مجھے بھی گھر میں ایک بزرگ کی ضرورت ہے۔ریاض نے شیداں کو دیکھا جو جلی ہوئی روٹی اتار کر توے پر پراٹھا ڈال رہی تھی۔مگر اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔اور چہرے پر شرم کی لالی تھی جس میں خوشی اور فخر کی جھلک نمایاں تھی۔چاچا منہ میں نوالہ رکھے گنگ بیٹھا اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔شیداں نے توے پر پکتے ہوئے پراٹھے پر ایک چمچ بھر کر اور گھی ڈالا اور مسکرا کر اپنے ہونٹ کاٹنے لگی ۔

مزاحیہ شاعری (فاروق قیصر)

ناک منہ میں غبار بھرتا ہوں
جب ترے شہر سے گزرتا ہوں

کوڑا کرکٹ ہے ٹھہرا پانی ہے
دُھول دُھوئیں کی حکمرانی ہے

ٹوٹی سڑکیں ہیں اور آبادی ہے
سانس لینے سے بھی میں ڈرتا ہوں

غنڈہ گردی کی بس آزادی ہے
جب ترے شہر سے گزرتا ہوں

شہر کی بس میں جو سوار ہوا
بس یوں سمجھو کہ ذلیل و خوار ہوا

بندہ یوں بے بس لگے جو رکشے میں
جیسے بندر ہو بند کٹہرے میں

گندگی میں پیر دھرتا ہوں
جب ترے شہر سے گزرتا ہوں

ہسپتالوں میں بھیڑ تھانوں میں
دم گھٹا جاتا ہے مکانوں میں

چڑچڑا پن ہے اور تھکاوٹ ہے
یہاں کی ہر چیز میں ملاوٹ ہے

توبہ توبہ میں دل میں کرتا ہوا
جب ترے شہر سے گزرتا ہوں

اطہر شاہ خان

ادا کیا تھا میں اس کا ادھار آدھا
جبھی سے تو اس کو رہ گیا اعتبار آدھا
یہ ہم جو بیوی کو آدھی تنخواہ دے رہے ہیں
تو دال کو بھی دے رہی ہے بگھار آدھا
ضرور مٹی کا تیل ساقی پلا گیا ہے
جو پورے ساغر سے ہو رہا ہے خمار آدھا
اگر ترا ہاتھ دل پہ ہوتا تو کیا نہ ہوتا
کہ نبض دیکھی تو رہ گیا ہے بخار آدھا
تو ظاہر ہے اس کی نفرت میں پیار آدھا
وہ زہر میں ڈال کر وٹامن بھی دے رہا تھا

خالدعرفان

میں تو اہل ہوں کسی اور کا مری اہلیہ کوئی اور ہے
میں ردیف مصرعہ عشق ہوں مرا قافیہ کوئی اور ہے
جو لغت کو توڑ مروڑ دے جو غزل کو نثر سے جوڑ دے
میں وہ بد مذاق سخن نہیں وہ ” جدیدیا“ کوئی اور ہے
ترے دست ناز نے عالیہ یہ کہاں کا گوشت پکا لیا
ترا لنچ کھا کے پتہ چلا کہ یہ کوفتہ کوئی اور ہے
میں ترا کزن تو میری کزن ، کریں رقص پھر سر انجمن
نہ مرا چچا کوئی اور ہے ۔ نہ ترا چچا کوئی اور ہے
ہے مری غزلکا بھرم ابھی مرے نرخرے میں دم ابھی
میں جواب شاعر ہند ہوں مرا ٹیٹوا کوئی اور ہے
ترا مرا ایک رسول ہے ترا میرا ایک خدا مگر
مرا مولوی کوئی اور ہے ترا پیشوا کوئی اور ہے
کسی تجربے کی تلاش میں مرا عقد ثانوی ہو گیا
مری اہلیہ کو خبر نہیں مری اہلیہ کوئی اور ہے

عقل مندی ☆ عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اگر آپ اپنی بیوی سے بحث میں جیت گئے ہیں تو بعد میں اس سے معافی مانگ لیں ۔☆ ہمیشہ وہی کرو جو تمہیں کرنا چاہیئے نہ کہ وہ جسے کرنے کو تمہارا دل چاہے **بادشاہ سلامت**۔ مجھے بادشاہ سلامت بننے کا بہت شوق ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ جب میں گھر سے نکلوں تو دو تین گھنٹے پہلے شہر کی تمام سڑکوں پر ٹریفک معطل کر دی جائے۔ جس کے نتیجے میں بسیں، ویگنیں، رکشے، تانگے کاریں اپنی منزل پر پہنچنے کے لئے ان گلیوں اور سڑکوں میں گھُس جائیں جدھر سے واپسی کا راستہ بھی نہیں ہوتا۔ ایسے مواقع پر لوگوں کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔ اگلے روز یہ خبر تمام اخبارات کے چوکھٹے میں شائع ہو کہ ” بادشاہ سلامت“ نے کار روک کر عوام سے ان کے مسائک دریافت کئے اور ایک بیوہ کی درخواست پر موقع پر احکامات جاری کئے۔

ایک دعا۔ یا اللہ میرے چہرے کو اسٹیڈیم کی پچ کی طرح خوبصورت بنا دے اور میرے چہرے سے کیل ،مہاسوں اور چھائیوں کو کلین بولڈ کر دے۔ پوری دنیا میں میانداد کے چھکے کی طرح میری شہرت ہو لوگ اشتیاق سے یوں میری صورت دیکھیں جیسے پاکستان اور بھارت کا میچ دیکھتے ہیں۔ **کچھ لوگ** ☆ کچھ لوگ خطوط کی طرح ہوتے ہیں جنھیں بار بار پڑھ کر بھی دل نہیں بھرتا اور دل چاہتا ہے کہ وہ ہمیشہ ہمارے پاس رہیں۔ ☆ کچھ لوگ دعاؤں کی طرح ہوتے ہیں ابھی ہم سجدے میں ہی سر جھکائے ہی ہوتے ہیں کہ وہ اشکوں کی طرح آنکھوں سے ٹپک پڑتے ہیں۔ ☆ کچھ لوگ نگاہ کی طرح ہوتے ہیں وہ ہمارے ساتھ ہوں تو اندھیروں میں راستے مل جاتے ہیں۔ ☆ کچھ لوگ

گھروں کی طرح ہوتے ہیں وہ چاہے کتنی بھی دور کیوں نہ ہوں دل ان کی روح میں سمٹ جانے کے لئے بے چین رہتا ہے

۔زندگی کا کھیل۔کرکٹ کے ایک کھلاڑی نے اپنے دادا جان کی موت کی خبر دیتے ہوئے اپنے دوست کو یوں لکھا:۔ پیارے دوست سوچتا ہوں کہ تمہیں کیسے لکھوں۔قلم ساتھ نہیں دے رہا تم دادا جان کوتو اچھی طرح جانتے تھے وہ نہ صرف کپتان تھے بلکہ ہماری ٹیم کے اوپنر بھی تھے۔زندگی کی پچ پر وہ ہمیشہ جم کر کھیلتے رہے۔اس سے انکار نہیں کہ وہ کئی دفعہ سلپ بھی ہوئے مگر یہ زندگی کے ہر کھلاڑی کے ساتھ ہوتا ہے۔خاص کر جب پچ گیلی ہو۔اور زندگی کی پچ ہر وقت صاف بھی نہیں رہتی۔مگر کھلاڑی وہ ہے جو سنبھل جائے گر کر۔دادا جان بھی ایک ایسے ہی کھلاڑی تھے۔ تمشائیوں نے ہمیشہ ان کے کھیل پر داد دی۔مگر پتہ نہیں کیا ہوا۔کہ'' میٹھے خان کی رفاقت انہیں کچھ راس نہ آئی۔وہ کئی دفعہ شکر کے ہاتھوں ''ایل بی ڈبلیو'' ہوتے ہوتے بچے۔پرسوں صبح جب وہ بیٹنگ کرنے آئے تو خاصے ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔اردگرد پریشانیوں کی مضبوط فیلڈنگ کی پرواہ کئے بغیر وہ بیاسی ۸۲ رنز بنا چکے تھے اور ہماری ٹیم کو امید تھی کہ وہ اپنی سنچری مکمل کریں گے۔ مگر وائے افسوس کہ زندگی کے اوور ختم ہو چکے تھے۔ٹھیک بارہ بج کر بیس منٹ پر باؤلنگ تبدیل ہوگئی اور وہ دنیا کے خطرناک ترین بالر''ہارٹ اٹیک'' کی بال پر عزرائیل کے ہاتھوں کیچ آؤٹ ہو کر واپس چلے گئے۔تمہارا کرکٹر ادوست۔

شمائل حضرت محمد ﷺ

عامر امیر

ہمارے سید و مولیٰ آنحضرت ﷺ کا وجود باجود ایسا شجرہ طیبہ ہے جس کی شاخیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔اور جڑیں فطرت انسانی کی پاتال میں پیوست ہیں۔ایک ایسا سدا بہار درخت ہے۔جو ہر موسم ہر زمانہ میں اپنے رب کے اذن سے پھل دیتا ہے۔آپ کی سیرت ایسا شجر مبارکہ ہے کہ جو شرقی ہے نہ غربی بلکہ کل عالم اس کے فیض سے معطر ہوتا ہے۔ایک ایسی بارش ہے کہ جو ہر خشکی اور تری پر اُترتی اور نہال ہوتی ہے۔ایک ایسا نور ہے جو ہر تاریکی کو اُجالے میں بدل دیتا ہے۔ایک فرقان ہے جو حق و باطل میں فرق کر دیتا ہے۔الغرض ایک ایسا لال بے بہا ہے جس کے اوصاف لکھنے کے لئے سات سمندر سیاہی اور تمام درخت قلمیں بن جائیں تب بھی اس کا حق ادا نہیں ہوتا فطرت انسانی میں کتنا تنوع ہے۔اس کی ضرورتیں ان گنت اور مسائل بے شمار ہیں۔ملک ملک ،قوم قوم قبیلہ قبیلہ، ،فرد فرد ایک لا متناہی سلسلہ ہے جو ذاتی اور اجتماعی اور پھر بین الاقوامی تعلقات کے حوالہ سے کامل رہبر کا متلاشی ہے۔اور حضرت محمد ﷺ کی ہستی وہ کامل ہستی ہے جو کسی کو مایوس نہیں کرتی۔ہر ضرورت مند کا ہاتھ پکڑتی اور اسے روشنی دکھاتی ہے۔زمین سے زمین اور پھر آسمان تک راستوں کے مسافر کو ہر قدم پر زادراہ مہیا کرتی ہے مبارک وہ جو اس چاند سورج کو اپنے سینے میں اتار لے۔اور دل میں بسا لے۔حضرت محمد ﷺ کی پاک سیرت کا چمن ہزاروں شاخوں اور لاکھوں پھولوں سے سجا ہوا ہے۔یہ دلکش مناظر ان پاک وجودوں نے بیان کئے ہیں۔جنہوں نے اس صاحبِ جلال و جمال کو اپنی ظاہری و باطنی آنکھوں سے دیکھا۔جنہوں نے اس چشمہ رواں سے جام بھر بھر پیئے۔اور اس حسن و احسان کی تابنا کی سے خود بھی روشن ہو کر ستارے بن گئے۔حضرت محمد ﷺ کی سیرت نوروں کا مجموعہ ہے۔جس سے

رنگا رنگ کی شعائیں پھوٹتی ہیں اور سیرت کے ہر واقعہ سے متعدد اخلاق کی طرف راہنمائی ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس رحمت عالم کی سچی اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔جس کی پیروی سے خدا تعالیٰ ملتا ہے اور ظلماتی پردے اٹھتے ہیں اور اسی جہان میں سچی نجات کے آثار نمایاں ہوتے ہیں **سیرت نبوی کا جامع نقشہ**

حضرت علی سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے آپ کی سنت کے بارہ میں پوچھا۔تو آپ نے فرمایا:۔معرفت میرا سرمایہ

ہے اور عقل میرے دین کی بنیاد اور محبت میری اساس اور شوق میری سواری اور ذکر الہیٰ میرا مونس،وثوق میرا خزانہ،غم میرا رفیق،علم میرا ہتھیار،صبر میری چادر،رضا میری غنیمت،عاجزی میرا فخر،زہد میرا پیشہ،صدق میرا شفیع،اطاعت الہیٰ میرا حسب،جہاد میرا خلق،اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔ذکر الہیٰ میرے دل کا پھل ہے اور میرا غم میری امت کے لئے اور میرا شوق اپنے رب عزوجل کی طرف ہے۔(الشفاء عیاض بن موسیٰ صفحہ ۸۱)

آنحضرت ﷺ کا اخلاقی اعجاز۔'' اخلاقی حالت ایک ایسی کرامت ہے کہ جس پر کوئی انگلی نہیں رکھ سکتا۔اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے رسول اللہ ﷺ کو سب سے بڑا اور قوی اعجاز اخلاق کا ہی دیا گیا جیسے فرمایا۔اَنَّک لعَلیٰ خُلقٍ عظیم۔یوں تو آنحضرت ﷺ کے ہر قسم کے خوارق قوت ثبوت میں جملہ انبیاء علیھم السلام کے معجزات سے بجائے خود بڑھے ہوئے ہیں مگر آپ کے اخلاق اعجاز کا نمبر ان سب سے اوّل ہے۔جس کی نظیر دنیا کی تاریخ نہیں بتلا سکتی اور نہ پیش کر سکتی ہے۔(ملفوظات جلد اول ص ۸۹)

اخلاق الٰہیہ کا کامل نمونہ۔'' آنحضرت ﷺ کی زندگی ایک عظیم الشان زندگی ہے۔آپ آنحضرت ﷺ نے اخلاق فاضلہ کے اور کیا بلحاظ اپنی قوت قدسی اور عقد ہمت اور کیا بلحاظ اپنی تعلیم کی خوبی اور تکمیل اور کیا بلحاظ اپنے کامل نمونہ اور دعاؤں کی قبولیت کے۔غرض ہر طرح اور ہر پہلو میں چمکتے ہوئے شواہد اور آیات اپنے ساتھ رکھتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر ایک غبی سے غبی انسان بھی بشرطیکہ اس کے دل میں بے جا غصہ اور عداوت نہ ہو صاف طور پر مان لیتا ہے کہ آپ تخلّقُوا بِاخلاقِ اللہ کا کامل نمونہ اور کامل انسان ہیں''۔

حسن مجسم اور ظاہری حسن کا بے مثال نمونہ۔حضرت حسن بن علیؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہؓ سے آنحضرت ﷺ کا حلیہ پوچھا کیونکہ وہ آنحضرت ﷺ کا حلیہ بیان کرنے میں بہت ماہر تھے اور میں چاہتا تھا کہ وہ میرے پاس آنحضرت ﷺ کے متعلق ایسی باتیں بیان کریں جنہیں میں پلے باندھ لوں۔حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ میرے ماموں نے حضور ﷺ کا حلیہ مجھ سے کچھ یوں بیان فرمایا۔آنحضرت ﷺ کی آنکھوں ﷺ اور سینہ میں ایسی کشش تھی اور ایسا حسن تھا کہ جو دیکھنے والوں کو مرعوب کر لیتا تھا۔آپؐ کا چہرہ مبارک بھرا ہوا تھا۔شرافت اور عظمت کے آثار اس پر نمایاں تھے۔اور رعب و وجاہت اس سے ٹپکی پڑتی تھی۔وہ چاند کی طرح چمکتا تھا۔اور حسن اس میں موجیں مارتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔آپ نہ تو کوتاہ قد تھے اور نہ حد سے زیادہ لمبے بلکہ آپ کا قد بہت مناسب اور درمیانہ تھا۔سر بڑا تھا اور بال گھنے تھے۔جو کانوں کی لو تک پہنچتے تھے۔لیکن اس سے نیچے نہیں گرتے تھے۔ان میں قدرتی طور پر ایسا سنوار پایا جاتا تھا۔کہ وہ کبھی بھی بکھرتے یا پراگندے نہیں ہوتے تھے۔اور انہیں کنگھی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔بعض اوقات آپؐ کے بالوں میں خود بخود مانگ پڑ جاتی تھی۔جو نمایاں ہوتی تھی۔ورنہ حضورؐ خود عام طور پر مانگ نہیں نکالتے تھے۔آپ کا رنگ سفید اور کھلتا ہوا تھا۔پیشانی کشادہ تھی۔اَبرو باریک لیکن بھرے

ہوئے لمبے ہلالی تھے۔دونوں ابروؤں کے درمیان فاصلہ تھا۔غصہ کی حالت میں اَبروؤں کے اس درمیانی فاصلہ میں ماتھے پر ایک رگ ابھر کر نمایاں ہوجاتی تھی۔ناک پتلی اور کھڑی ہوئی تھی۔جو سرسری نظر دیکھنے والوں کو اصل سے زیادہ اُٹھی ہوئی نظر آتی تھی۔اس پر نور چھلکتا تھا۔داڑھی گھنی تھی۔رخسار نرم اور ملائم تھے۔دہانہ کشادہ تھا۔دانت خوب چمکتے تھے۔وہ ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے تھے۔بلکہ ان میں ایک قدرتی فاصلہ تھا۔جو بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔اور آپ کی لمبی گردن بس اُس کا حسن نہ پوچھو اُسے تو خدا نے اپنے ہاتھ سے گھڑا تھا اور وہ چاند کی طرح چمکتی تھی۔جسم کی عمومی بناوٹ بہت موزوں تھی۔وہ بھرا بھرا لیکن بہت متناسب تھا۔پیٹ کمر کے ساتھ لگا ہوا تھا۔اور سینہ پیٹ کے ساتھ ہموار تھا۔آپ کا سینہ چوڑا اور فراخ تھا۔آپؐ کے جوڑ مضبوط بھرے ہوئے اور نمایاں تھے۔جلد چمکتی ہوئی نرم اور ملائم تھی چھاتی اور پیٹ پر بال نہیں تھے۔ہاں بالوں کی ایک باریک دھاری سینے کے نیچے سے ناف تک چلی گئی تھی۔سینہ کے اوپر کے حصہ اور کاندھوں پر اسی طرح کلائی سے کہنیوں تک ہاتھوں پر خوب بال تھے۔ہاتھ(یعنی کلائی سے کہنیوں تک بازوئں کے حصے) لمبے تھے۔دست چوڑے تھے انگلیاں لمبی تھیں۔ہاتھ اور پاؤں نرم اور گوشت سے خوب بھرے ہوئے تھے۔تلوے زمین کے ساتھ ہموار نہیں تھے۔بلکہ درمیان سے ان میں خم تھا۔پیر ایسے چکنے اور ملائم تھے کہ جب ان پہ پانی پڑتا تھا تو ٹھہرتا نہیں تھا فوری بہہ جاتا تھا۔چال ایسی سبک تھی جیسے ڈھلوان پر سے اتر رہے ہوں۔لیکن بڑی ہی پُر وقار اور باوجود تیزی کے قدم زمین پر ٹھہراؤ سے پڑتا تھا۔چہرہ اٹھا کر نہیں چلتے تھے،اکڑ کر اور گھسٹتے نہیں تھے قدم اٹھا کر چلتے تھے۔جب کسی کی طرف رخ پھیرتے تھے تو پورا رُخ پھیرتے تھے۔۔نظر ہمیشہ نیچی رکھتے تھے۔یوں لگتا جیسے فضا کی نسبت زمین پر نظر زیادہ پڑتی تھی۔عادتاً نیم وا نظروں سے نگاہ ڈالتے اور جب صحابہ کے ساتھ چل رہے ہوں تو ہمیشہ انہیں اپنے سے آگے رکھتے تھے جب کسی سے آمنا سامنا ہوتا تو ہمیشہ آپ ہی سلام میں پہل کیا کرتے تھے۔‘‘(شمائل ترمذی باب فی خلق رسول اللہ)دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ آپ کی آنکھیں بہت خوبصورت اور سیاہ تھیں سُرمہ نہ بھی لگائے ہوئے ہوں تو لگتا یہی تھا کہ سرمہ آنکھوں میں پڑا ہوا ہے آنکھوں کی سفیدی میں ہلکی سی سرخی بھی جھلکتی تھی۔چہرہ مبارک پر ہمیشہ بشاشت ہوتی تھی۔اور مسکراہٹ بکھری رہتی تھی۔فرفر کر کے کلام نہیں کرتے تھے۔بلکہ ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے تھے۔گفتگو میں سمجھانے کا انداز نمایاں ہوتا تھا۔اور بات کو اکثر دہرایا کرتے تھے۔تاکہ دوسرے کے ذہن نشین ہو جائے۔کوہِ وقار تھے۔کسی ایسی حرکت کا سرزد ہونا ناممکن تھا جو دوسروں میں کراہت پیدا کرے۔ہر ادا دل کو موہ لینے والی تھی۔ہر انداز میں حسن ٹپکتا تھا۔آپ نہایت پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس میں حسن نے اپنا کمال نہ دکھایا ہو چہرہ حسین تھا۔جسم مرقع حسن تھا۔انداز بیاں سحر کُن تھا۔نگاہ مبارک اُٹھتی تھی تو فضا میں حسن بکھر جاتا تھا۔اُٹھنا بیٹھنا سونا،آپ کی مجلس آپ کی خلوت سب کچھ ہی تو حسن میں ڈوبا ہوا تھا یہ تو ایسی داستان ہے جس کا بیان ختم نہیں ہو سکتا۔چاند سے زیادہ حسین۔حضرت جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ ہم باہر کھلے میدان میں بیٹھے تھے حضورؐ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے۔اور ایک سُرخ لباس زیب تن کئے ہوئے تھے۔چاندنی رات تھی۔چودھویں کا چاند تھا۔خوب روشن،بڑا حسین،لیکن میری نگاہ بار بار حضورؐ کے چہرہ کی طرف اُٹھتی تھی۔حضورؐ آج بہت ہی پیارے لگ رہے تھے۔حضورؐ کا حسن تو ہمیں ہمیشہ ہی گھائل کئے رکھتا تھا۔لیکن آج تو یہ کچھ اور ہی رنگ دکھار

ہا تھا۔میں سوچتا تھا کہ اس چہرہ سے زیادہ کوئی اور چیز حسین ہو سکتی ہے۔پھر میری نگاہ چاند پر پڑی پھر میں نے حضورؐ کے چہرہ کی طرف دیکھا پھر چاند کو دوبارہ دیکھا پھر حضورؐ کے رخ مبارک پر نگاہ گڑ گئی۔اُف! آپ کتنے حسین لگ رہے تھے۔میں نے کہا نہیں اے چاند تیرا حسن اس حسن کے آگے ماند پڑ گیا ہے۔(شمائل ترمذی)

زرا سی ایک بدلی سائباں ہوتی تو اچھا تھا
سرِ صحرا کہیں تھوڑی سی چھاں ہوتی تو اچھا تھا
غم و آلام سے ڈر کے میرا دل مجھ سے کہتا ہے
کہ ایسے میں دُعا دینے کو ماں ہوتی اچھا تھا
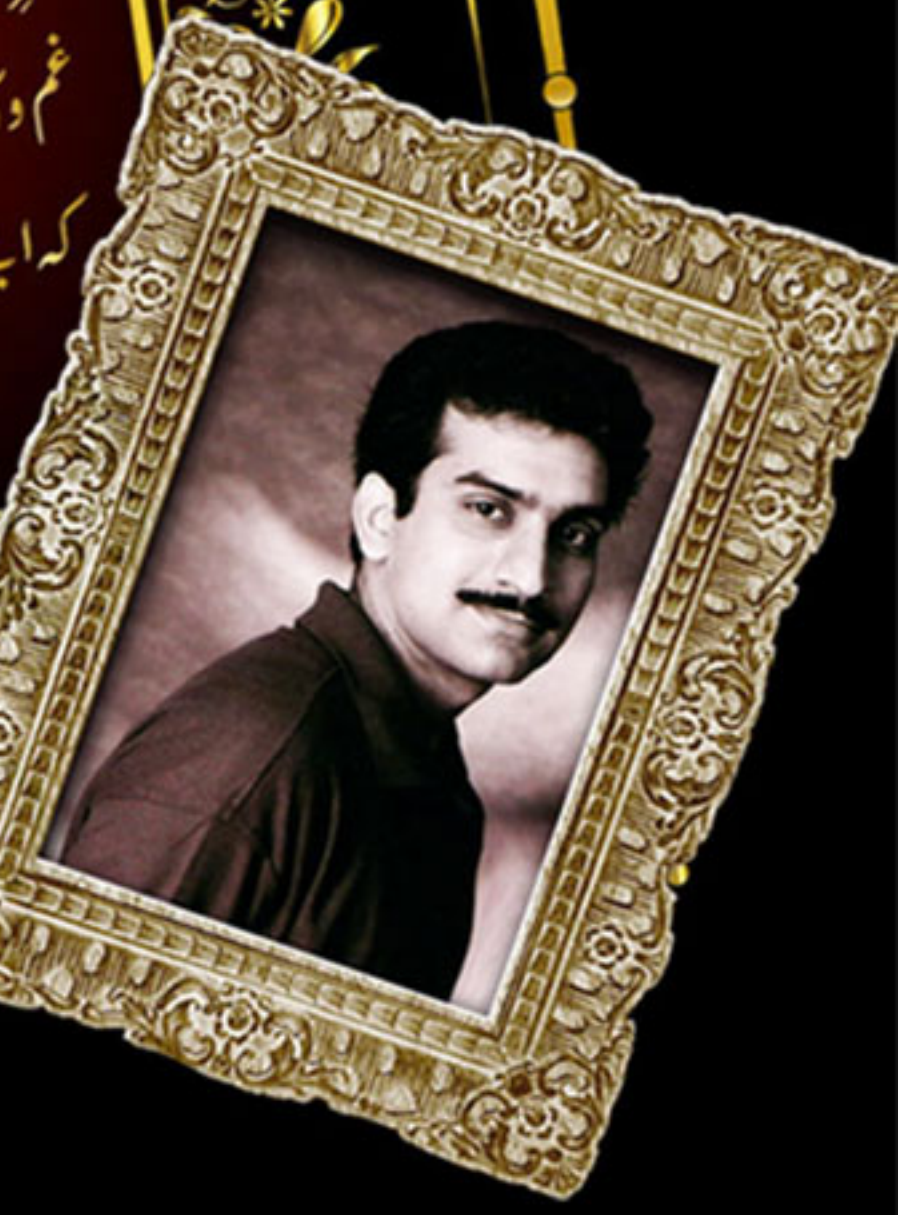
عامر امیر